جلاوطن کی واپسی

ڈاکٹر انوار احمد*

Abstract:

In the backdrop of ideological perceptions of establishment this article deals those political and extra cultural factors which forced Faiz ahmad Faiz to opt the painful phase of"self-exile" during Zia era.After the inception of democratic rule in Pakistan,it seems that a ban has been lifted upon the writings and thoughts of Faiz Ahmad Faiz in our public institutions as well.So,it is not only the the physical return of Exile but acceptance of cultural impact of departed,detached and deported creative souls too.

سزائے موت کے خلاف اپنی اپیل کے سلسلے میں پاکستان کے پہلے منتخب وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو (۱۹۲۸ـ۱۹۷۹) نے سپریم کورٹ میں تین دن تک خطاب کے آخر میں کہا کہ اب اگر میری اپیل مسترد ہو جائے تب بھی میں عدالت کا ممنون رہوں گا کہ انھوں نے مجھے اپنی بات کہنے کا موقعہ دیا۔ اگلے روز عدالتی قتل کے منتظر بعض اخبارات نے یہ ستم ظریفانہ شہ سرخی لگائی کہ ذوالفقار علی بھٹو نے آخر کار عدالتِ عالیہ پر اعتماد کا اظہار کر دیا۔ کم و بیش اسی اسلوب میں بعض لوگ فیض احمد فیض کی وطن بدری یا جلا وطنی کو بھی خود ساختہ کہتے ہیں اور عام طور پر فیض احمد فیض کے اس طرح کے بیانات کا حوالہ دیتے ہیں کہ بھئی ہمیں کسی نے وطن بدر تو نہیں کیا تھا ہم باہر گئے تھے اور پھر کچھ ایسے حالات ہو گئے کہ ہمیں اپنی مرضی سے ہی باہر رُکنا پڑا۔ فیض خود کہتے ہیں: 'یہ میرا مقدر تھا کہ میں چھ سال تک ایک ایسی صورتِ حال میں جسے آپ خود ساختہ جلاوطنی کہہ لیجئے، وطن سے دور ساری دنیا میں پھرتا رہوں، جلاوطن کے طور

* صدر نشین، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

پر خواہ جلاوطنی اختیاری ہو یا کچھ اور، آپ ایک مستقل احساسِ محرومی کے ساتھ زندہ رہتے ہیں اور یہ وہ صورتِ حال ہے جو اپنے محبوب کے ہجر سے مماثلت رکھتی ہے پہلے پہل تو کیفیت ناسٹلجیا یا وطن کی تھی، لوگوں کے لئے اور مقامات کے لئے اور اس طرزِ زندگی کے لئے جو آپ کو عزیز ہے، ان سب کے لئے دلی اشتیاق کی تھی لیکن اس صورتِ حال میں آپ کا ذاتی تجربہ سیاسی رنگ و آہنگ حاصل کر لیتا ہے'(۱) یہ درست ہے کہ فیض صاحب کو کسی باقاعدہ حکم کے ذریعے وطن بدر نہیں کیا گیا تھا مگر ہر شخص جانتا ہے کہ جب مارشل لاء نافذ کر دیا جائے، بنیادی انسانی حقوق معطل کر دیے جائیں اور ان حقوق کی ضمانت دینے والا دستور بھی سرد خانے میں رکھ دیا جائے تو پھر اس سرزمین پر رہنے والا ہر خود دار اور حساس شخص جلاوطن ہو جاتا ہے کیونکہ وطن سے لوگوں کا رشتہ ان کے بنیادی انسانی حقوق کے طفیل بیدار رہنے والے احساسِ شرکت کی بدولت ہوتا ہے اور جب انھیں اس سے محروم کر دیا جائے تو پھر وہ احساس مغائرت یا بیگانگی کا رویہ پیدا ہوتا ہے جو ملکوں کی تاریخ ہی نہیں جغرافیہ کو بھی بدل دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فیض احمد فیض میں صبر اور بردباری کا جذبہ بہت تھا مگر ضیا الحق کے مارشل لاء کے نفاذ کے ساتھ ہی فیض پر مرئی اور غیر مرئی پہرے دار بڑھ گئے تھے، لڈمیلا نے لکھا ہے 'فیض کے مکان کے دروزے پر مسلح سپاہی صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک باری باری پہرا دیتے تھے، جہاں جہاں فیض جاتے، ایک سپاہی سایہ بن کر ان کا پیچھا کرتا تھا۔ ۱۹۷۸ء کے اوائل میں فیض نے ملک چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا......ایک صبح فیض ہاتھ میں سگریٹ لیے گھر سے نکلے، پہرا دینے والے سپاہی نے سوچا ہوگا کہ فیض حسب معمول چہل قدمی کرنے والے ہیں اور تھوڑی دیر بعد لوٹ آئیں گے............لیکن اب کی بار چہل قدمی کرتے کرتے، فیض ہوائی اڈے پر پہنچے............اور ملک سے باہر چلے گئے۔''

اسی طرح کون نہیں جانتا کہ اُن کی وطن بدری کے دوران لاہور میں اُن کی سالگرہ کے حوالے سے جو تقریب فروری ۱۹۸۱ء میں منعقد ہوئی اس کے سٹیج سیکرٹری اداکار محمد علی اور ان کے داماد اور مقالہ نگار شعیب ہاشمی کو بھی پولیس پکڑ کر لے گئی، کوٹ لکھپت جیل میں جب بعض قیدیوں نے ان سے پوچھا کہ آپ کا تعلق کس پارٹی سے ہے تو شعیب ہاشمی نے کہا برتھ ڈے پارٹی سے۔

اسی زمانے میں جب فیض نے وہ شہرہ آفاق نظم لکھی جو اس طرح شروع ہوتی تھی:

مرے دل مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں

کریں رُخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یار، نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتا تھا اپنے گھر کا

ہم سبھی جانتے ہیں کہ فیض [۱۹۱۱۔۱۹۸۴] کی ان نظموں کو 'نثار میں تیری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے' یا 'آج بازار میں پابجولاں چلو' یا 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' کو جادوئی بنانے والے اُن کے حقیقی تجربات ہیں جو جسم و جاں کی صعوبتوں پر محیط ہیں۔ وہ ۹/مارچ ۱۹۵۱ء سے ۲۰/اپریل ۱۹۵۵ء تک قید میں رہے، پھر دسمبر ۱۹۵۸ء سے لے کر اپریل ۱۹۵۹ء تک اسیر رہے، ضیاالحق کے زمانے میں اُنہیں سرکاری سطح پر جلاوطن تو نہیں کیا گیا مگر یہ ایک طرح سے اُن کا طویل جلاوطنی ہی کا تجربہ تھا جس نے اُن سے ''دلِ من مسافرِ من'' جیسی نظم تخلیق کرائی، اور اس نظم اور تجربے نے ان کے ہم وطنوں کو وطن میں رہتے ہوئے بھی جلاوطنی کے مشترک درد سے منسلک کر دیا تھا، جنہیں غاصبوں نے نہ صرف احساسِ شرکت سے محروم کر دیا تھا، بلکہ مذہبی فاشزم نے انہیں اگلے جہان کے لئے بھی راندہ قرار دے دیا تھا۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں نہتے اور کم وسیلہ لوگ اپنی کسی محبوب مگر سرکاری معتوب شخصیت کو نہ پھانسی گھر سے نکال سکتے ہیں اور نہ کسی بندی خانے سے، مگر وہ اپنی بے بسی کا کفارہ اپنی محبت کی لو، کو کچھ اور اُکسا کر، کچھ اور بڑھا کر کرتے ہیں، منٹو، فیض، جالب، جوش، شیخ ایاز، استاد دامن اور گل خاں نصیر چند ایسی ادبی اور تہذیبی شخصیتیں ہیں، جن سے وہ لوگ بھی پیار کرتے ہیں، جو فتویٰ طرازوں، کوتوالوں اور شہر یاروں کی خشونت اور عقوبت سے تو انہیں نہ بچا سکے، مگر ان کے والہانہ پیار نے انہیں محبوبِ خلائق ضرور بنا دیا۔

فیض کے خلاف معلوم سیاسی اسباب کی بنیاد پر جہاں پاکستان کے خودساختہ محافظوں کی جانب سے ایک فردِ جرم کم از کم ۴ عشروں تک سیاہ کی جاتی رہی، جسے پاکستانیوں کی ثقافتی یادداشت کبھی خاطر میں نہ لائی فیض کی زندگی، وجود، لفظ، اور کردار اسی بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ ہمارے عہد کی ایک عظیم شخصیت تھے، کیونکہ زندگی میں ان کا طرزِ عمل اور رویہ انہی قدروں کا آئینہ دار تھا جن سے ان کا عہد استوار تھا۔ شاعروں اور فن کاروں سے ناقدری عالم کا گلا اکثر سننے میں آتا ہے اور اس کا شاید جواز بھی ہے مگر فیض نے اسیری میں بے روزگاری میں، کفر اور غداری کے فتووں میں طعن و تشنیع کے ماحول میں جلاوطن کے ایام میں بھی کبھی ناقدری عالم کا گلہ نہیں کیا۔ نہ بے مہر زمین سے

جنم لینے پر تاسف کا اظہار کیا، نہ ذرائع ابلاغ اور سرکار دربار کے آنکھیں بدلنے پر ملول ہوئے۔انہوں نے شکایت کی تو صرف یہ کہ

’ہم پہ لطف وعنایات کی اس قدر بارش رہی ہے، اپنے دوستوں کی طرف، اپنے ملنے والوں کی طرف سے اور ان کی طرف سے جن کو ہم جانتے بھی نہیں کہ اکثر ندامت ہوتی ہے کہ اتنی زیادہ محبت کا مستحق ہونے کے لئے جو تھوڑا بہت ہم نے کیا ہے، اس سے بھی بہت زیادہ ہمیں کرنا چاہیئے تھا۔‘‘(۲)

یہ بھی ناقدری عالم کا گمان یا اندیشہ ہوتا ہے جو فن کاروں کو خودنمائی کے لئے کم پسندیدہ اطوار اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اپنی دستارِ فضیلت کو اپنی شناخت کا بنیادی حوالہ بنانا پڑتا ہے۔ اپنے تصورفن اور تصور حیات کی وضاحت بہ انداز اشتہار کرنا پڑتی ہے۔اپنے بارے میں باتیں، اپنے آپ سے باتیں پسند کی جاتی ہیں مگر فیض سے آشنا سبھی جانتے ہیں کہ ان کی طبیعت میں انکسار کس درجے کا تھا اور انہیں اپنے بارے میں باتیں کرنے سے کس قدر وحشت ہوتی تھی بلکہ وہ شعر اور نثر میں واحد متکلم کا صیغہ استعمال کرنے سے گریز کرتے اور معصومانہ انداز میں ہم کہتے دکھائی دیتے ہیں:

’’اپنے بارے میں باتیں کرنے سے مجھے سخت وحشت ہوتی ہے بلکہ میں تو شعر میں بھی حتی الامکان واحد متکلم کا صیغہ استعمال نہیں کرتا اور میں کی بجائے ہمیشہ ہم لکھتا آیا ہوں۔‘‘(۳)

لیکن اس انکسار کا مطلب غیر مشروط سپر اندازی نہیں، جو مقام انا کے اعلان اور حفظ خودی کا ہوتا تھا، اس سے غافل بھی نہ تھے، چنانچہ ایک خط میں اپنی بیٹی منیزہ کو لکھتے ہیں’’ہم اب بھی امیروں، وزیروں کو پاؤں کو دھول سمجھتے ہیں، اصل تسلی کی بات تو اپنے علم و ہنر کی ہے۔‘‘(۴)

اس زمانے میں سب نے دیکھا کہ تنگ نظری کے مسلح محافظوں نے کون سی تہمت اور کون سا سنگ دشنام فیض کی جانب نہ اچھالا مگر فیض نے اس روش کے بدلے میں ہمیشہ عالی ظرفی اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کیا، اخلاقیات سے متعلق ان کا تصور تھا’’اگر کسی کا عقبیٰ یا آسمانی احکامات پر ایمان نہ ہو تو نیکی اور اخلاق کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ جو لمحہ حق وصداقت کی ہر روش میں گزرے، وہ بجائے خود خوشی کا ایسا خزینہ بن جاتا ہے، جسے کوئی رہزن لوٹ نہیں سکتا، نہ کوئی جابر ضبط کر سکتا ہے، شاید مذہبی اصطلاح میں توشہ آخرت کے صحیح معنی یہی ہیں‘۔(۵)

فیض کی حیات اور فن کا مطالعہ کرنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ انہیں حافظ کا یہ شعر کس قدر پسند تھا:

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینم
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

چنانچہ ان کی پوری زندگی انسانوں اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں میں صرف ہوئی، جیل سے ایلس کے نام لکھے گئے خطوط میں سے دو اقتباسات دیکھئے:

''اس اجتماعی دکھ درد کے علاوہ، جو صرف معاشرتی انقلاب ہی سے دُور ہوسکتا ہے، انفرادی رنج و ملال کے ایسے اسباب بھی بہت ہیں، جو تھوڑی سی محبت، شفقت اور سمجھ بوجھ سے اگر دُور نہیں کیے جاسکتے تو کم ضرور کیے جاسکتے ہیں۔''(۶)

''ہمارے دوست سرجیت سنگھ نے کہا تھا Peace comes from within اگر یہاں ہوتے تو میں انہیں بتاتا کہ اس کے صحیح معنی کیا ہیں، اب صحیح طور پر پتہ چلا ہے کہ اگر اپنے دل میں جرم و گناہ کا کوئی احساس نہ ہو تو آدمی عذاب اور دکھ درد سب مفارقتیں، سب سختیاں، سب صعوبتیں غرض وہ سب کچھ برداشت کرسکتا ہے، جو باہر سے اس کی ذات پر نازل ہوں، صرف گناہ کا احساس، خطاکاری کا احساس یا اپنے آپ سے دغا کرنے کا احساس ایسی چیز ہے، جس کا کوئی مداوا، کوئی علاج نہیں ہوسکتا۔''(۷)

زنداں میں بلکہ موت کے سائے میں رہ کر بھی فیض کو یقین ہے کہ ''اگر آج کا دن موجود ہے، تو کل کا دن بھی برحق ہے۔ اسی طرح ہر دکھ بھرا دن جو گزرتا ہے، اپنی تسکین اپنے ساتھ لاتا ہے، یہ تسکین لاتا ہے کہ جو دن گزر چکا ہمیشہ کے لیے معدوم ہو چکا اور اس کے بعد جو بھی دن آئے گا، اس سے مختلف ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ اس سے بہتر ہو، اس لیے لازم ہے یہی ہے کہ آنے والے دنوں پر نظر جمائے رکھیں اور بیتے دنوں کو جملہ ساکنانِ عدم کے ساتھ دفن ہو جانے دیں۔'' (ایضاً، ص: ۱۲۰) اگر ہم غور سے دیکھیں تو فیض کی شخصیت اور فن کی اساس بے کراں اور عالم گیر محبت پر ہے اور اس سے یقین اور آرزو کا چراغ جلتا ہے اور یہی سب سے بڑا سچ ہے اور اس کی قیمت ادا کرنا وہ مجاہدہ ہے جسے فیض نے شاعری کے لیے ضروری قرار دیا:

''تھوڑا بہت جو ہم نے کیا ہے، اس میں یہ ہے کہ جھوٹ نہ بولیں، زندگی میں غالباً کبھی کبھار تو یہ مجبوری تو ہو جاتی ہے کہ آدمی سچ نہ بول سکے لیکن اس پر کوئی مجبور نہیں کرسکتا کہ جھوٹ بولو۔ دوسری کوشش یہ کی ہے کہ کوئی ایسی بات نہ کہیں جس کی وجہ سے اپنے آپ پر یا کسی دوسرے پر اخلاقی طور پر کوئی حرف آئے، تیسرے یہ کہ لوگوں سے محبت کی ہے، سب سے۔''(۸)

جوش ملیح آبادی (۱۸۹۸۔۱۹۸۲) کی معصومیت، راست بازی اور مصلحت سوزی کا ایک زمانہ قائل ہے، فیض کے بارے میں ان کی اس رائے کی بہت معنویت ہے، وہ کہتے ہیں: ''اردو شعراء کی سیرت کے متعلق مَیں اچھی رائے نہیں رکھتا، یہ ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے اور ایک دوسرے کو ذلیل کرنے کو سب سے بڑی عبادت سمجھتے ہیں، مَیں نے اپنی تمام عمر میں صرف تین چار شاعروں کو پاک نفس دیکھا ہے اور مجھ کو ایک راست گو انسان کی طرح

اس بات کے اظہار سے مسرت ہو رہی ہے کہ ان چند اِنے گِنے پاک نفس شعراء کے درمیان فیض کا چہرہ بھی دمک رہا ہے"(۹)

جب اپنے اشعار میں فیض یہ دعویٰ کرتے ہیں تو ان کی شخصیت کی دل نوازی کے سبب کسی کو یہ تعلّی کے اشعار محسوس نہیں ہوتے۔

عاجزی سیکھی،غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے ،دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے،رخِ زرد کے معنی سیکھے

(نسخہ ہائے وفا،ص ۷۰)

اسی طرح،ان کے یہ اشعار غیر جمہوری اور فاشی دور میں مزاحمت کرنے والے طالب علموں،استادوں،صحافیوں اور دانش وروں کے لئے ایک وعدہ،ایک تسلی، ایک خانہ سوز وارفتگی کا جواز بنے رہے ہیں۔

گر آج تجھ سے جدا ہیں،تو کل بہم ہوں گے
یہ چار دن کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے،طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں:
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

(ایضاً،ص ۱۶۳)

....

رنگیں لہو سے پنجۂ صیاد کچھ تو ہو
خوں پر گواہ دامنِ جلّاد کچھ تو ہو
جب خوں بہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو

(ص،۲۸۱)

چشمِ نم جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشقِ پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پابجولاں چلو
(ص،۳۳۳)

ہر اِک اولی الامر کو صدا دو
کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے
اُٹھے گا جب جمع سرفروشاں
پڑیں گے دارو رسن کے لالے
کوئی نہ ہو گا کہ جو بچا لے
جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اُٹھے گا شورِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہوگا
(ص،٦١٩)

شیخ ایاز (۱۹۲۳۔۱۹۹۷) نے ساہیوال جیل کی اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ میرے لئے شہید کی آخری لمحے کی کشمکش، تخلیقی اعتبار سے بڑی پرکشش ہے، (ترجمہ: کرن سنگھ، دانیال، کراچی ص:۳۴) تو اس جلاوطن کے باب میں ایک دو ایسے لمحے ہیں، جن کی پردہ داری ہم ایسے ان کے مداح کرتے ہیں، خالد حسن نے جہاں یہ لکھا ہے کہ وہ تمام عرصہ جو فیض نے جلاوطنی میں گذارا، اس میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں تھا، جب انھوں نے وطن پلٹ کر نہ جانے کا سوچا ہو، حتیٰ کہ بھارت میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں وزٹنگ فیلوشپ بھی اس لیے قبول نہ کی کہ ایسی کوئی ذمہ داری ان کی جلاوطنی کو باضابطہ بنا دے گی۔'' (۱۰)

مگر خالد حسن نے ہی فیض کی یہ خود کلامی یا سرگوشی بھی درج کی ہے ''ایسا نہیں کہ ہم میں لڑنے کی سکت نہیں، تاہم یہ ضرور ہے کہ پہلے کی طرح نوجوان نہیں رہا، جب آپ بوڑھے ہو جائیں تو جسمانی سزا کے لیے تیار رہنا مشکل ہو جاتا ہے روح تو آمادہ ہوتی ہے، جسم ذرا متامل ہو جاتا ہے۔'' (۱۱)

اس کے بعد کی ایک دو ملاقاتوں کے حوالے سے کشور ناہید لکھتی ہیں:

''ایک دفعہ ہندوستان جانا تھا مگر ان پر پابندی لگی ہوئی تھی، ملاقات کے لیے ضیاء الحق سے وقت مانگا۔ اس نے فوراً بے تاب ہو کر وقت دیا۔ ہم سب مرجھا گئے۔ خفگی کا اظہار کیا۔ تو کہنے لگے ''ہم یہ زمانے جوانی میں دیکھ چکے، اب ہماری جیل جانے کی رہی نہیں۔۔۔ جب سی آئی ڈی لگی تو باہر جانے کی اجازت لینے کے لیے بھی اس فرینکو سے ملے۔ ہم نے بہت برا منایا۔ احمد فراز نے تو کئی دفعہ جھگڑا بھی کیا مگر کیا کرتے بیٹی بضد تھی کہ اس کی ٹرانسفر کروائی جائے۔''(۱۲)

فیض ایسے سٹیبلشمنٹ کے معتوب کرداروں کی آج اس قدر پذیرائی یا جلاوطن کی واپسی پر کتب، اور یادگاری جرائد کی اشاعت، سیمینار، موسیقی اور مصوری کی محفلوں اور نمائشوں سے یہ خدشہ ضرور ہو سکتا ہے کہ کہیں یہ ان کی تخلیقی ذات سے رومانوی یا نیم اساطیری لگاؤ کم نہ کر دیں، مگر وقت ثابت کر رہا ہے کہ خطوط، یادداشتیں، کتابیں اور دستاویزات ان کی ذات اور فن کی محبوبیت کے سرچشموں کی تفہیم کو ایک طرف آسان اور دوسری طرف ویسے مشکل بنا رہی ہے، جیسے محبت کہنے اور کرنے کو شاید آسان لگتی ہے مگر اس کے بھید سمجھنے میں ایک عمر لگ جاتی ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ فیض کی استقامت اور صعوبتیں اپنی جگہ مگر ان کے ہاں وہ تلخ نوائی پیدا نہ ہوئی جو ان کے قبیلے کے دوسرے شاعروں جیسے ناظم حکمت یا پابلو نرودا کے ہاں دکھائی دیتی ہے اور یہی وصف انہیں ایک بڑے قافلے کا ہم سفر بنا کر بھی ممتاز رکھتا ہے:

''میں انصاف کرنے کے لیے، بلکہ محبت کرنے کے لیے پیدا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ تقسیم کرنے والے بھی، جو مجھ پر حملے کرتے ہیں، خود پہلے میری شاعری سے توانائی حاصل کرنے کے بعد میری آنکھیں نکالنے کے لیے کوشاں رہے۔ اگر کچھ نہیں تو کم از کم میری خاموشی کے حق دار تھے۔ میں کبھی بھی اپنے دشمنوں میں گھومنے پھرنے سے اس لیے خوفزدہ نہ تھا کہ میں خود کو آلودہ کر لوں گا، جو میرے دشمن تھے وہی عوام کے دشمن تھے۔''(۱۳)

اپنے بارے میں ماہِ نو لاہور سارک ادب نمبر نومبر دسمبر ۸۸، ترجمہ سجاد باقر رضوی، مشمولہ فیضانِ فیض مرتبہ: شیما مجید، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۸، ص: ۴۳]

حوالہ جات

۱۔ مرے دل،مرے مسافر، پرورشِ لوح قلم،آکسفرڈیونیورسٹی پریس، کراچی ص:۲۶۶

۲۔ شمعِ نظر،خیال کے انجم،جگر کے داغ ،مشمولہ خونِ دل کی کشید[مرتب: مرزا ظفر الحسن] مکتبہ اسلوب کراچی،۱۹۸۳،ص:۹

۳۔ فیض از فیض، دستِ تہہ سنگ، کاروانِ ادب لاہور،۱۹۷۴،ص:۱۵

۴۔ لاؤ تو قتل نامہ مرا[مرتب]عبداللہ ملک،کوثر پبلشرز،لاہور۱۹۸۲،ص:۲۶

۵۔ 'صلیبیں میرے دریچے میں'، دانیال کراچی ۲۰۱۱،ص:۴۰

۶۔ ایضاً،ص:۸۷

۷۔ ایضاً،ص:۳۳

۸۔ زلف کی اسیری، زنجیر کی اسیری، خونِ دل کی کشید،ص:۱۹

۹۔ فیض فہمی، ڈاکٹر سید تقی عابدی،ملٹی میڈیا افیرز،لاہور،۲۰۱۱،ص:۲۸

۱۰۔ Faiz A Memoir Coming back home, Compiled by Sheema Majeed, Oxford 2008 P.125

۱۱۔ ایضاً ص ۱۳۱

۱۲۔ ''مرے دل......مرے مسافر،فیض صاحب، ماہنامہ ادبیات، اسلام آباد۔''

۱۳۔ 'یادیں، پابلو نرودا کی آپ بیتی ترجمہ انور زاہدی ص:۶۳۔۶۴